خواجہ شمس الدین عظیمی

پیارے بچو!

آپ نے کتاب ''ہمارے بچے'' کی پہلی سیریل پڑھی اور اس میں لکھی ہوئی باتوں کو قبول کیا اور ان پر عمل کیا۔

کتاب ''ہمارے بچے'' میں آپ نے تین باتیں پڑھی تھیں:

۱۔ بچے اور والدین یعنی بچے اور ماں باپ

۲۔ انسان اور حیوان

۳۔ ہم دنیا میں آنے سے پہلے کہاں رہتے تھے؟ اور اس دنیا سے جانے کے بعد کہاں رہتے ہیں؟

میں نے آپ کے لئے دوسری کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں ''اولیاء اللہ'' یعنی اللہ کے دوستوں کے واقعات ہیں۔

بچو!

کیا آپ کو پتہ ہے کہ دوست کون ہوتا ہے؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوست وہ ہوتا ہے جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ جس کی عادتیں آپ جیسی ہوتی ہیں۔ ''اولیاء اللہ'' یعنی اللہ کے دوست بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ کی فرمائی ہوئی باتوں پر عمل کرتے ہیں، ہر کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کرتے ہیں۔ اللہ کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے، کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے، درخت لگا کر خوش ہوتے ہیں، پڑھتے ہیں، لکھتے ہیں، استاد کا ادب کرتے ہیں اور جو کچھ استاد پڑھاتے ہیں اسے یاد رکھتے ہیں۔ اماں ابا کا کہنا مانتے ہیں اور ان سے پیار کرتے ہیں، بہن بھائیوں کا خیال رکھتے ہیں، بڑوں کو سلام کرتے ہیں اور چھوٹوں سے محبت کرتے ہیں۔ ایسے بچے اللہ تعالیٰ کے دوست ہوتے ہیں۔

پیارے بچو!

اپنے دوستوں کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میں ان کے ہاتھ بن جاتا ہوں وہ میرے ذریعے چیزیں پکڑتے ہیں، میں ان کی زبان بن جاتا ہوں وہ میرے ذریعے بولتے ہیں۔''

اب آپ ''ہمارے بچے'' کی دوسری کتاب پڑھیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے خوش ہوں۔ (آمین)

آپ کا دوست

خواجہ شمس الدین عظیمی

فہرست

جان نثار دوست۔ایک درخت

درخت نے کہا۔

میں جنگل میں اپنے بھائی درختوں کے ساتھ رہتا تھا۔ جنگل میں پیدا ہوا اور جنگل میں جوان ہو گیا۔ جوان ہونے کے بعد میری نسل کا سلسلہ شروع ہوا۔ آدمی کی نسل تو ایک ایک کر کے پھیلتی ہے مگر میری نسل ایک وقت میں ہزاروں ہوتی ہے۔

آدمی کے اندر ریڑھ کی ہڈی دراصل تنے کی طرح ہے۔ اور تنا درخت میں ریڑھ کی ہڈی ہے۔ جوانی میں جب تناور درخت بنا تو سینکڑوں شاخوں پر لاکھوں پتے نکل آئے۔ جیسے انسانوں کے چہرے اور جسم پر بال نکلتے ہیں۔ شاخوں پر پھل آ گئے، پھل لگ گئے تو چڑیوں کیلئے راشن کا بندوبست ہو گیا۔ نہیں معلوم کہاں کہاں سے پرندے آتے اور میرے دسترخوان پر سے خوب سیر ہو کر کھاتے اور اڑ جاتے تھے۔

ایک دن من موہنی چھوٹی سی چڑیا آئی۔ اس نے خوب پیٹ بھر کر گولر کھائے اور پھر سے اُڑ گئی۔ ہوا میں اُڑتی رہی اور دور جا کر اسے آدمی کی طرح رفع حاجت کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی بیٹ (پوٹی) جب زمین پر گری تو اس میں گولر کا بیج تھا۔ زمین نے گولر کے بیج کو اپنی گود میں سمیٹ لیا۔

زمین کی گود میں حرارت و برودت (گرمی اور سردی) سے بیج میں ایک نئی زندگی دوڑ گئی اور بالکل اسی طرح جس طرح آدمی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، میں نے بھی زمین کی کوکھ سے جنم لیا لیکن فرق یہ تھا کہ آدمی کی ماں اپنے بچے کو سردی، گرمی، بھوک پیاس سے محفوظ رکھتی ہے مگر میری ماں کے پاس سردی گرمی سے بچاؤ کیلئے کپڑے نہیں تھے۔ بھوک پیاس رفع کرنے کیلئے دودھ نہیں تھا۔

مجھے بھوک پیاس کا تقاضا پورا کرنے اور سردی گرمی سے حفاظت کیلئے خود ہی انتظام کرنا تھا۔ میں نے یہ بات جان لی تھی کہ درخت کی ماں صرف بیج پیدا کرنے تک ماں ہوتی ہے۔ پیدائش کے مراحل سے گزر کر درخت کو خود اپنے ایک پیر پر کھڑا ہونا

پڑتا ہے۔ میں نے مردانہ وار نہیں درختانہ وار بارش، آندھی، طوفان کا مقابلہ کیا اور ایک درخت بن گیا۔ جس کے نیچے ایک دو دس بیس نہیں پچاس آدمی دھوپ کی تمازت سے بچنے کیلئے میرے سائے میں ٹھہرتے تھے اور آرام کرتے تھے۔

میں خوش تھا کہ میں اس حیثیت سے آدمیوں میں افضل ہوں کہ کوئی درخت کسی آدمی کے سائے میں نہیں رہتا۔ میں نے ابھی جوانی کی پوری بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں کہ ایک دن مکروہ شکل آدمی آیا اور بغیر قصور کے پے درپے میرے اوپر کلہاڑی کے وار کئے، میں بہت رویا اور چیخا۔

میں نے کہا:

"اے میرے دوست آدمی! میں نے آندھیوں اور طوفان کا مقابلہ کر کے خود کو اس قابل بنایا ہے کہ تو اور تیری اولاد، میرے سائے میں رہے اور تو میرے خون (جسے تو پانی کے برابر بھی نہیں سمجھتا) سے بنے ہوئے پھل کھائے اور ان کے رس سے اپنی توانائی میں اضافہ کرے۔"

لیکن اس ظالم آدمی نے میری کسی التجا پر کان نہیں دھرا، میری کوئی بات نہیں سنی۔ میرے اندر کلہاڑی سے پڑنے والے گھاؤ میں سے رسنے والے خون سے وہ اتنا بھی متاثر نہیں ہوا کہ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ہی ٹپک جائے۔

وہ دیوانہ وار میرے وجود کو تیز دھار کلہاڑی سے زخمی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میں روتا بلکتا زمین پر گر گیا۔ آدم زاد نے اس پر بھی بس نہیں کی میری بڑی بڑی شاخوں کو جو میرے جسم میں ہڈیوں کے قائم مقام تھیں اس آدمی نے الگ الگ کر کے چولہے میں جھونک دیا اور مجھے جلا کر خاک کر دیا۔

میری اولاد زندہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انسان سے انتقام نہیں لے گی۔ اس لئے کہ انتقام جیسی بری عادت تو آدمی کو زیب دیتی ہے۔

میں ایک درخت ہوں۔ میرا اصل مسکن جنگل ہے جہاں درندے بھی رہتے ہیں۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی درندے نے کسی درندے کو بلاوجہ قتل کیا ہو۔ یہ بدنمائی آدم زاد کے حصے میں آئی ہے کہ وہ اپنے بھائی آدم کو قتل کر دیتا ہے۔ جب آدم خود اپنا قاتل بن گیا ہے تو اس سے شکوہ کرنے کا کیا فائدہ۔۔۔۔۔ اور شکوہ بھی کون کرے؟

درخت کا کام خدمت کرنا ہے اور انسانوں کو فائدہ پہنچانا ہے، میرے بچے درخت اس وصف کو قائم رکھیں گے۔ اے اشرف المخلوقات انسان!

یادرکھو!

*محبت زندگی ہے۔

*انتقام عقوبت اور عذاب ہے۔

*ظلم ہلاکت ہے۔

*حُلم، بردباری اور نرم دلی عافیت اور امن ہے۔

*قتل گناہ اور بزدلی ہے۔

*معاف کردینا بہادری ہے۔

فقط

آدمیوں کا جاں نثار دوست

ایک درخت

حاتم طائی

یمن میں ایک قبیلہ آباد تھا۔ جس کا سردار حاتم طائی تھا۔ حاتم طائی کی سخاوت سے دنیا کا ہر آدمی واقف ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کچھ لوگ جب قید ہو کر آئے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پتہ چلا کہ ان قیدیوں میں حاتم طائی کے قبیلہ کی ایک خاتون بھی ہیں تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"خاتون کا رہا کر دیا جائے۔"

خاتون کو جب رہائی کی خوشخبری سنائی گئی تو اس نے یہ کہہ کر آزاد ہونے سے انکار کر دیا کہ میرے ساتھ قبیلے کے دوسرے افراد بھی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قبیلے کو آزاد کر کے مال غنیمت واپس کر دیا۔ ساتھ ساتھ اپنی طرف سے انعام واکرامات سے نوازا اور بہ نفس نفیس تشریف لے جا کر قبیلے کو رخصت کیا۔

حاتم طائی کی سخاوت کے لئے ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے:

روم کے بادشاہ کے دربار میں ایک دن حاتم طائی کی سخاوت کا تذکرہ ہوا۔ ایک شخص نے بتایا کہ حاتم طائی کے پاس عمدہ نسل کا ایک گھوڑا ہے۔ خوبصورت اتنا ہے کہ جو بھی دیکھتا ہے اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہتا۔ حاتم طائی کی تعریف سن کر بادشاہ نے کہا:

"جب تک کسی آدمی کو آزمایا نہ جائے اس وقت تک اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا عقل کے خلاف ہے۔"

بادشاہ نے وزیر سے کہا:

"جاؤ اور حاتم طائی کی سخاوت کے بارے میں ہمیں معلومات فراہم کرو اور اس سے کوئی ایسی چیز طلب کرو جو اس کی نظر میں سب سے زیادہ قیمتی ہے۔"

ایک درباری نے کہا:

"حاتم طائی کے لئے سب سے زیادہ عزیز اور سب سے زیادہ قیمتی چیز ایک تیز رفتار گھوڑا ہے۔"

بادشاہ کو درباری کی یہ بات پسند آئی اور اس نے وزیر سے کہا:

"تم حاتم طائی کے پاس جاؤ اور اس سے اس کا گھوڑا مانگو۔ اگر وہ گھوڑے کا ایثار کر دیتا ہے تو حاتم طائی یقیناً سخی ہے۔"

وزیر اور بادشاہ کے درباری منزلیں طے کرتے ہوئے رات کے وقت حاتم طائی کے گھر پہنچے۔ جس وقت یہ لوگ وہاں پہنچے موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ گھپ اندھیرے میں بادلوں کی گرج چمک ماحول کو خوفناک بنا رہی تھی۔

ایسے خراب موسم میں گھر سے نکلنا بھی ممکن نہیں تھا۔ مہمانوں کے کھانے کا انتظام کرنا مشکل کام تھا لیکن حاتم طائی نے میزبانی کا حق ادا کیا اور مہمانوں کی تواضع اور آرام و آسائش کا پورا پورا انتظام کر دیا۔ دستر خوان پر لذیذ بھنا ہوا گوشت کھا کر مہمان خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے اندر سفر کی تھکان کی جگہ توانائی محسوس کی اور گہری نیند سو گئے۔

صبح کے وقت بارش تھم چکی تھی اور فضا گرد و غبار سے صاف ہو گئی تھی۔ درخت دھلے ہوئے تھے۔ ہوا ٹھنڈی تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آکسیجن گھونٹ گھونٹ اندر اتر رہی ہے۔ ناشتہ کے دوران وزیر نے مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور آنے کا مقصد بیان کیا۔

وزیر نے کہا:

"ہمارے بادشاہ کے سامنے آپ کے گھوڑے کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ بادشاہ چاہتا ہے کہ آپ اپنا گھوڑا بادشاہ کی خدمت میں نذر کر دیں۔"

وزیر کی بات سن کر حاتم طائی افسوس کے ساتھ ہاتھ ملنے لگے اور افسردہ ہو کر بولے:

"اگر آپ گھوڑا لینے آئے تھے تو یہ بات آتے ہی مجھے بتا دینی چاہئے تھی لیکن اب میں مجبور ہوں اس لئے کہ میرا پیارا گھوڑا اس دنیا میں نہیں ہے۔ پوری رات طوفانی بارش برستی رہی۔۔۔۔۔ میرے لئے ممکن نہیں تھا کہ اتنے سارے لوگوں کے کھانے کا انتظام کر سکوں۔

یہ بھی ممکن نہ تھا کہ گاؤں گوٹھ سے ضیافت کے لئے کوئی جانور منگوا سکتا۔ لہٰذا میں نے گھوڑے کو ذبح کر دیا اور اس کا بھنا ہوا گوشت دستر خوان کی زینت بن گیا۔"

وزیر حاتم طائی کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ بادشاہ کو جب یہ سارا واقعہ سنایا گیا تو بادشاہ نے بھی حاتم طائی کی سخاوت کی تعریف کی۔

رب راضی۔۔۔۔۔۔سب راضی

مائی صاحبہ بہت خوب صورت تھیں، کتابی چہرہ تھا، ہرن جیسی آنکھیں تھیں۔ بال چاندی کے تاروں جیسے تھے۔مائی صاحبہ ہر وقت گھومتی پھرتی رہتی تھیں۔ان کا معمول تھا کہ کبھی کسی کے گھر چلی گئیں اور کبھی کسی کے گھر۔ جس کے گھر جاتی تھیں اس کے گھر میں خیر و برکت ہو جاتی تھی۔لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ مائی صاحبہ زیادہ دن ان کے گھر میں رہیں۔

ایک دن جب مائی صاحبہ میرے (خواجہ شمس الدین عظیمی) گھر آئیں تو گھر میں بچوں نے شور مچادیا:

''دادی آ گئیں۔دادی آ گئیں۔''

دادی نے بھی اپنے معصوم پوتے پوتیوں کو کلیجے سے لگالیا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

بڑی بیٹی ناصرہ مدنان نے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا:

''دادی اپنی زندگی کے بارے میں بتائیں؟''

مائی صاحبہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئیں، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور انہوں نے اپنی آپ بیتی اس طرح سنائی:

''میرا نام جیاتی تھا، میں چودہ سال کی تھی کہ میری شادی ہو گئی۔ابھی دلہن بنے کچھ دن ہی گزرے تھے کہ شوہر کا انتقال ہو گیا۔ سسرال والوں نے مجھے ستی (شوہر کی لاش کے ساتھ بیوی کو جلانا) کرنے کے مشورے شروع کر دیئے۔ میرے کانوں میں بھنک (اڑتی ہوئی خبر) پڑ گئی۔ میں گھپ اندھیرے میں رات کو سسرال سے میکے پہنچی۔ماتا جی نے مجھے سینے سے لگایا لیکن میرے والد نے میرا اس طرح سسرال چھوڑ کر میکے آنا پسند نہیں کیا۔جب آدھی رات گزر گئی تو ماں نے مجھے پچھلے دروازے سے باہر نکال دیا۔ میں چلتی رہی، چلتی رہی۔ یہاں تک کہ افق سے سورج نمودار ہوا۔ایک درخت کے نیچے لیٹ کر سو گئی۔جب نیند سے بیدار ہوئی تو پھر چل پڑی۔۔۔۔۔۔میری منزل تو کوئی تھی نہیں اس لئے چلتی رہی۔ پیر لہولہان ہو گئے اور حلق خشک ہو گیا۔ لگتا تھا کہ حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں۔ چلتے چلتے معلوم نہیں کس طرح خواجہ غریب نوازؒ کے دربار میں پہنچ گئی۔ ڈر اور

خوف کا غلبہ اتنا تھا کہ مزار کے اندر جا کر میں نے کنڈی لگالی اور خواجہ غریب نوازؒ کی قبر سے لپٹ گئی۔ سکون ملا۔ لگتا تھا کہ میں دو چار سال کی بچی ہوں اور خواجہ غریبؒ کی قبر ماں کی گود ہے۔ ادھر میں محبت و پیار کی کیفیت سے سرشار تھی کہ باہر لوگ چیخنے لگے، دروازہ کھولو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دروازہ کھولو اور دروازہ پیٹنے لگے۔

میں نے دروازہ کھول دیا اور وہاں جھاڑو دینے کی خدمت میں معمور کر دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد پاکستان بنا تو یہاں آگئی۔"

چھوٹی بیٹی حنا نے پوچھا:

"دادی اماں آپ کو ہمارے گھر کا پتہ کس نے بتایا ہے؟"

مائی صاحبہ زور سے ہنسیں اور فرمایا:

"بیٹی جس بندے کو اپنے اصل مالک کا پتہ مل جاتا ہے اس کے لئے کوئی ٹھکانہ کوئی مقام ڈھونڈنا مشکل نہیں ہوتا۔"

سبحان اللہ کیا سعید دن تھے کہ پورے دن محسوس ہوتا رہا کہ نور کی بارش برس رہی ہے۔

رات کو رخصت ہوتے وقت میں نے مائی صاحبہ سے عرض کیا:

"اماں کوئی نصیحت کیجئے؟"

مائی صاحبہ آسمان کی طرف تکنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی مقام پر نگاہ ٹھہر گئی ہے۔ یکایک ایک آواز بلند ہوئی، شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھی اور مائی صاحبہ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے:

"بیٹا!۔۔۔۔۔۔ رب راضی۔۔۔ سب راضی۔"

شیر اور بکری

عام بچوں کی طرح میں بھی ایک بچہ تھا، مجھے بکریاں پالنے کا شوق تھا۔۔۔۔۔میرے پاس جو بکری تھی وہ بری یا بر بری بکری تھی۔۔۔۔۔بر بری بکری اسے کہتے ہیں جس کے سینگ برائے نام ہوتے ہیں اور اس کی کھال پر نقش و نگار ہوتے ہیں۔ بکری مجھ سے اتنی مانوس تھی کہ میرے ساتھ رہتی تھی۔ سردیوں میں اسے رضائی اُوڑھا دیتا تھا۔ ہم دونوں دوست لحاف اوڑھ کر سوتے تھے۔ بکری کیلئے زمین پر روئی کا گدا بچھا ہوا تھا۔ میں نے اس زمانے میں سنا تھا کہ انسان کے بچے بڑے ہو کر بستر کو ناپاک کر دیتے ہیں لیکن بکری اتنی پاکیزہ اور سلیقہ شعار تھی کہ اس نے کبھی بستر خراب نہیں کیا۔

اللہ نے بکری کی گود بھر دی۔ اس کے دو بچے ہوئے۔۔۔۔۔بچے بہت خوبصورت تھے۔ جب وہ ماں بن گئی تو وہ اپنے بچوں کے پاس رہنے لگی۔۔۔۔۔بہت پیار سے اپنے بچوں کو دودھ پلاتی تھی۔ محبت میں انہیں سونگھتی تھی۔

حالات اس طرح ہو گئے کہ بکری کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا اور میں اپنی بکری کو اس کے بچوں کے ساتھ، ایک ریوڑ میں چھوڑ آیا۔ کئی سال گزر گئے بکری کی یاد قصہ پارینہ (پرانا قصہ) بن گئی۔۔۔۔۔لیکن بکری کی نسل بڑھتی رہی۔۔۔۔۔اور یہ نسل ایک ریوڑ بن گیا۔

پھر حالات پلٹے۔۔۔۔۔جہاں یہ ریوڑ رہتا تھا وہ بستی اُجڑ گئی اور چرواہا بھی دنیا میں نہیں رہا۔۔۔۔۔چرواہے کی اولاد دوسرے گاؤں میں منتقل ہو گئی۔۔۔۔۔

اس جنگل میں جہاں بکریاں چرتی تھیں، ایک شیر کا بچہ آ گیا۔

بکریاں درختوں کے پتے چر رہی تھیں۔۔۔۔۔دو ٹانگیں زمین پر تھیں دو ٹانگیں درخت پر تھیں کہ بر بری بکری کو شیر کا ایک ننھا سا بچہ نظر آیا۔۔۔۔۔بکری نے اس بچے کو غور سے دیکھا اس کے اندر ماِمتا کے جذبے نے کروٹ لی۔۔۔۔۔اس نے سوچا کہ ابھی شیر کی ماں آئے گی اور اپنے بچے کو لے جائے گی۔۔۔۔۔صبح سے دوپہر۔۔۔۔۔دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔۔۔۔۔شیرنی نہیں آئی۔۔۔۔۔

بکری کو فکر لاحق ہوئی۔۔۔۔۔کہ یہ چھوٹا سا بچہ کہاں جائے گا؟۔۔۔۔۔کیا کرے گا اور یہ بھوکا بھی تو ہے؟۔۔۔۔۔

بکری آگے بڑھی اس نے شیر کے بچے کو مامتا سے سونگھا۔ بچہ حیران و پریشان بکری کو دیکھتا رہا۔۔۔۔۔اٹھنے کی کوشش کی تو اس سے اُٹھا نہ گیا۔۔۔۔۔

بکری میں چونکہ مامتا جاگ گئی تھی اس لئے اس نے اپنے تھن شیر کے بچے کے سامنے کر دیئے۔۔۔۔۔بچے نے خوب سیر ہو کر دودھ پیا۔۔۔۔۔ بکری اسے اپنے ساتھ لے گئی۔

شیر کا بچہ بکریوں میں رہتا رہا۔۔۔۔۔اس کی نشو و نما ہوتی رہی اور وہ بڑا ہو گیا۔۔۔۔۔ شیر کا بچہ بکریوں کی برادری کا ایک فرد بن گیا۔۔۔۔۔

حالات کا رُخ بدلا۔۔۔۔۔ایک روز شیر شکار کے لئے کچھار (شیر کا گھر) سے نکلا۔۔۔۔۔اس نے شکار کرنے کا ارادہ کیا۔ شیر نے دیکھا کہ شیر کا بچہ بکریوں کے ساتھ گھوم پھر رہا ہے۔ شیر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور اس نے بار بار آنکھیں کھولیں۔۔۔۔۔بند کیں۔۔۔۔۔

اور جب اس کو اس بات کا یقین ہو گیا۔۔۔۔۔کہ بکریوں کے ریوڑ میں ایک شیر ہے تو شیر کو بہت غصہ آیا اور وہ زور سے دھاڑا۔۔۔۔۔اتنی زور سے کہ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے خوف سے اُڑ گئے۔۔۔۔۔جنگل میں چرندے سہم گئے۔۔۔

شیر نے بہت تیزی کے ساتھ دوڑ کر بکریوں پر حملہ کیا تو بکریوں نے اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنا شروع کر دیا۔ ان میں شیر کا بچہ بھی تھا۔ شیر اس کے پیچھے دوڑتا رہا اور اس نے شیر کے بچے کو پکڑ لیا۔۔۔

سہمے ہوئے خوف زدہ شیر کے بچے کو اپنے کچھار میں لے گیا اور اس کو بتایا کہ تو بکری نہیں شیر ہے۔۔۔۔۔لیکن شیر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ شیر ہے۔

شیر نے اسے غصہ سے دیکھا۔۔۔۔۔اس کو غیرت دلائی۔۔۔۔۔شیر کی بہادری کے قصے سنائے۔۔۔۔۔لیکن بکریوں میں رہنے والے شیر کے بچے کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔

شیر نے سوچا کہ کس طرح اسے یقین دلایا جائے کہ یہ شیر ہے۔

شیر اسے ایک تالاب پر لے گیا۔۔۔۔۔تالاب کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے شیر سے کہا کہ پانی میں دیکھ۔۔۔۔۔اس نے دیکھا کہ پانی میں دو شیر ہیں۔اب شیر نے ''بکری کے ساتھ رہنے والے شیر'' سے کہا۔۔۔۔۔دیکھ! غور سے دیکھ! تیری شکل اور میری شکل ایک جیسی ہے تو بکری جیسا نہیں ہے۔۔۔۔۔

شیر کو پانی میں اپنی صورت دیکھ کر اپنے شیر ہونے کا یقین آگیا۔۔۔۔۔شیر نے اسے بولنا سکھایا۔۔۔۔۔

شیر بولا تو اس کی آدھی آواز بکری کی طرح تھی اور آدھی آواز شیر کی تھی۔۔۔۔۔تو شیر دھاڑا۔۔۔۔۔اور ''بکری کے ساتھ رہنے والے شیر'' کو دھاڑنا سکھایا۔۔۔۔۔نتیجے میں شیر جو بکریوں کے ساتھ پھرتا تھا۔۔۔۔۔اس میں شیر کی خصوصیات بیدار ہو گئیں۔۔۔۔۔اور وہ شیروں کی طرح رہنے لگا۔۔۔۔۔

پیارے بچو!

یہ ایک کہانی ہے جو آپ نے پڑھی۔جس طرح ہر شئے کے دو رخ ہوتے ہیں جیسے گرم، ٹھنڈا، میٹھا، کڑوا، دن، رات وغیرہ اس کہانی کے بھی دو رخ ہیں۔۔۔۔۔

کہانی کا ایک رخ یہ ہے کہ آپ نے کہانی پڑھی۔۔۔۔۔کہانی پڑھ لی اور نتیجہ کوئی مرتب نہیں ہوا۔۔۔۔۔

کہانی کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس کہانی کا کیا نتیجہ نکلا؟۔۔۔۔۔

شیر نے یا بکری نے شیر کے بچے کے ساتھ جو کچھ کیا۔۔۔۔۔دونوں حالتوں میں شیر کے بچے نے استاد سے سیکھا۔۔۔۔۔

جب شیر کا بچہ ''بکری استاد'' کی شاگردی میں آیا تو وہ بکری کی طرح زندگی گزارنے لگا۔۔۔۔۔

اور جب اس کا استاد شیر بن گیا تو بکریوں میں رہنے والا شیر۔۔۔۔۔شیر بن گیا۔۔۔۔۔

پیارے بچو!

حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں۔۔۔۔۔

''بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کوئلہ کی طرح ہوتا ہے اور استادُ اسے ہیرا بنا دیتا ہے۔''

مچھلی اور سانپ

غوث علی شاہ صاحبؒ نے "تذکرہ غوثیہ" میں لکھا ہے۔

"دو آدمی نہر کے کنارے پانی میں پیر ڈالے بیٹھے تھے۔۔۔۔۔نہر میں مچھلی اور سانپ ایک ساتھ تیر رہے تھے۔۔۔۔۔ مچھلی نے سانپ سے کہا۔۔۔۔۔

اے سانپ! تجھے لوگ اچھا نہیں سمجھتے۔۔۔۔۔ تجھ سے ڈرتے ہیں۔۔۔۔۔تجھے دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے ہیبت زدہ ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔اور میں کتنی خوبصورت اور اچھی ہوں کہ لوگ مجھے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ مجھے ایکوریم Aquarium میں سجاتے ہیں۔۔۔۔۔اور مزے لے لے کر میری مختلف ڈشیں کھاتے ہیں۔۔۔

سانپ نے مچھلی سے کہا۔۔۔

میری بہن!۔۔۔۔۔ایسا نہیں ہے۔۔۔۔۔آدمی اپنے ڈر سے، اپنے خوف سے مر جاتا ہے۔

جب مچھلی نے سانپ کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا تو سانپ نے کہا۔۔۔۔۔

آؤ تجربہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔

یہ جو دو آدمی پیر لٹکائے بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ان میں سے ایک کے پیر میں، میں کاٹتا ہوں اور تم اُچھلنا۔ سانپ نے ایک آدمی کو ڈسا۔۔۔۔۔ مچھلی اُچھل کر پانی سے اوپر آئی اور پانی میں دوبارہ غوطہ لگا دیا۔

وہ آدمی ہنسا اور کہا۔۔۔۔۔

دیکھو مچھلی مذاق کر رہی ہے، مجھے چھیڑ رہی ہے۔

میرے پیر میں کاٹ کر گئی ہے۔

سانپ مچھلی سے بولا۔۔۔۔۔۔

بہن مچھلی!

ہم کچھ دیر انتظار کرتے ہیں کہ آیا اس کے اوپر زہر کا اثر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔اس آدمی کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔

مچھلی اور سانپ پانی کے رُخ تیرتے ہوئے آگے بڑھے۔۔۔۔۔۔دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے اور اس کے پیر بھی پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

سانپ نے مچھلی سے کہا۔۔۔۔۔۔

بی مچھلی! اس آدمی کے پیر میں اب تُو کاٹ۔۔۔۔۔۔میں اُچھلوں گا۔

یہی ہوا کہ مچھلی نے آدمی کے پیر میں کاٹا اور سانپ پانی کے اندر سے اُچھلا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ آدمی بے ہوش ہو گیا۔۔۔۔۔۔

آدمی جب بے ہوش ہو گیا تو سانپ نے مچھلی سے کہا۔۔۔۔۔۔

بی مچھلی! تم نے دیکھا کہ میرے ڈسنے کے بعد جب تم اُچھلی تو آدمی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ کسی زہریلے کیڑے نے کاٹا ہے اور اب جب کہ تم نے کاٹا اور میں اُچھلا تو آدمی یہ سمجھا کہ سانپ نے ڈسا ہے۔ سانپ میں زہر ہوتا ہے اس خوف سے وہ بے ہوش ہو گیا۔

اونٹ، بیل اور دُنبہ

ایک اونٹ، ایک بیل اور ایک دُنبہ !۔۔۔۔۔۔۔۔۔سفر کر رہے تھے۔۔۔۔۔انہوں نے دیکھا، راستے میں گھاس کا ایک گٹھر پڑا ہوا ہے۔۔۔۔۔تینوں کو بھوک لگ رہی تھی اور تینوں گھاس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔۔۔

دنبہ بولا۔۔۔۔۔بھائیو! یہ گھاس تو بہت تھوڑا سا ہے۔۔۔۔۔اتنا زیادہ نہیں ہے کہ اس کے تین حصے کر کے ہم تینوں تقسیم کر لیں۔۔۔۔۔اس طرح کسی کا بھی پیٹ نہیں بھرے گا۔۔۔۔۔لہٰذا میں سوچتا ہوں کہ اس گھاس کا حقدار میں ہوں۔۔۔۔۔اس لئے کہ میں تم سب سے بزرگ ہوں!۔۔۔۔۔

بیل نے پوچھا۔۔۔۔۔آپ کس طرح بزرگ ہیں؟۔۔۔۔۔

دنبہ نے کہا۔۔۔۔۔میں اپنی تعریف کرنا اچھا نہیں سمجھتا۔

دراصل بات یہ ہے کہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قربانی کے دنبہ کے ساتھ گھاس چرتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔

بیل نے جب یہ سنا تو وہ ناگواری سے بولا:

اے دنبے میاں! بس رہنے دو تمہیں پتہ نہیں، میں اس جوڑی کا بیل ہوں جس بیل سے حضرت آدم علیہ السلام نے زمین پر زراعت کے لئے پہلا ہل چلایا تھا۔

کہتے ہیں کہ اونٹ بڑا ہوشیار جانور ہے اور اس کی آنکھیں اتنی روشن اور چمکدار ہوتی ہیں کہ ان سے ذہانت ٹپکتی ہے (آپ کو کبھی اونٹ نظر آئے تو اس کی چمکدار، سرمگیں اور ذہین آنکھوں کو ضرور دیکھنا)۔

اونٹ نے دونوں کو شیخیاں بگھارتے سنا تو اس نے کچھ کہے بغیر گھاس کا پورا گٹھا منہ سے پکڑ کر اٹھا لیا اور گردن سیدھی کر کے اتنا اونچا کر دیا کہ دنبہ اور بیل دونوں منہ تکتے رہ گئے۔اونٹ نے جب ان دونوں کو مایوس دیکھا تو بولا:

"دوستو! اور میرے ہمسفر ساتھیو!

مجھے قیل و قال (باتیں کرنا) تو آتی نہیں۔۔۔۔۔اور نہ ہی میں اونٹوں کی تاریخ سے واقف ہوں!۔۔۔۔۔میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اونٹ بزرگ بھی ہوتے ہیں!۔۔۔۔۔

بھائیو! تم اپنی فضیلت تاریخ میں ڈھونڈتے رہو۔۔۔!! اصل بزرگی تو یہ ہے کہ وقت کا کیا تقاضہ ہے! تم اپنی اپنی بزرگی ثابت کرو اور میں چلتا ہوں۔۔۔۔۔خدا حافظ!

حضرت بابافریدالدین مسعود گنج شکرؒ

حضرت بابافریدالدینؒ کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ان کے والد کا نام حضرت شیخ جمال الدین تھا اور والدہ کا نام قرسم خاتون تھا۔ملتان کے ایک قصبے میں حضرت فریدالدینؒ ۵۸۶ ہجری میں پیدا ہوئے۔

حضرت فریدالدینؒ ابھی کم سن تھے کہ آپؒ کے والد کا انتقال ہو گیا اور تربیت والدہ نے کی۔بی بی قرسم خاتون عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں۔

فریدالدینؒ اپنی والدہ کو ماں جی کہتے تھے۔فریدالدینؒ جب ماں جی سے مٹھائی مانگتے تو وہ جائے نماز کے نیچے، شکر کی پڑیا رکھ دیتی تھیں،اور بیٹے کو دو نفل پڑھا کر کہتی تھیں کہ جائے نماز اٹھاؤ۔اللہ تعالیٰ تمہیں شکر دیں گے۔فریدالدینؒ جب دعا کرنے کے بعد جائے نماز کا کونا پلٹتے تھے تو انہیں وہاں سے شکر کی پڑیا مل جاتی تھی۔

ایک روز فریدالدینؒ کی والدہ شکر رکھنا بھول گئیں۔فریدالدینؒ نے نماز پڑھ کر مُصلّا پلٹا تو مُصلّا کے نیچے سے انہیں شکر کی پڑیا مل گئی۔یہ معاملہ دیکھ کر ماں جی سمجھ گئیں کہ ان کے بیٹے کے اندر یقین کی دنیا روشن ہو گئی ہے۔اس ہی دن سے ماں جی نے فرید الدینؒ کو مسعود گنج شکرؒ کہنا شروع کر دیا۔

بابافریدالدینؒ کے واقعہ میں ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کے اندر جب یقین پختہ ہو جاتا ہے تو اسے شک اور وسوسوں سے نجات مل جاتی ہے۔جو بچے اپنے والدین کا کہنا مانتے ہیں، بڑوں کو سلام کرتے ہیں اور چھوٹوں کو پیار کرتے ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے، غصہ نہیں کرتے، سر پر ٹوپی اوڑھتے ہیں، صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں، اگر بچوں کے ساتھ لڑائی ہو جائے تو گالیاں نہیں دیتے، ابا کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے جاتے ہیں اور قرآن مجید کو ترجمے کے ساتھ پڑھتے ہیں، ان کے اندر اللہ تعالیٰ کا یقین پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔۔۔

’’نمازی جب نماز قائم کرتا ہے تو وہ اپنے رب سے باتیں کرتا ہے۔

نمازی کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اللہ سے کیا باتیں کر رہا ہے۔‘‘

اس کا آسان اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ نماز اور نماز میں جو چھوٹی سورتیں پڑھی جاتی ہیں اس کا ترجمہ یاد کیجئے۔

بابا فریدالدینؒ نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ محترمہ سے حاصل کی جبکہ دیگر علوم میں آپؒ کے استاد محترم نذیر احمد صاحب تھے جو زمانے کے مشہور عالم دین تھے۔

بارہ برس کی عمر میں فریدالدینؒ اپنی والدہ کے ساتھ حج کرنے جا رہے تھے تو انہوں نے اپنی ماں سے کہا۔۔۔۔۔

’’میرا دل چاہتا ہے کہ میرے استاد بھی ہمارے ساتھ چلیں۔‘‘

ماں جی ان کی بات سن کر بہت خوش ہوئیں۔ یہ بڑے نصیب کی بات ہے کہ فریدالدینؒ مسعود نے اپنی والدہ اور اپنے استاد کے ساتھ حج کیا۔

حضرت ابراہیم ادھمؒ

حضرت ابراہیم ادھمؒ شاہانہ عظمت و جلال کے ساتھ تخت شاہی پر جلوہ افروز تھے۔ وزراء و امراء اور خادم دربار میں حاضر تھے اور عوام ادب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہی رعب سے دربار میں سناٹا تھا کہ ایک شخص دربار میں داخل ہوا۔ اس شخص کا لباس موٹے کھدر کا ایک چولا (لانبا کُرتا) اور پیروں پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ بالوں میں گرد و غبار کی تہہ تھی، وہ شخص کے تخت کے قریب آکر رُک گیا۔ حضرت ابراہیم ادھمؒ نے پوچھا:

''تم کون ہو؟''

اس آدمی نے کہا:

''میں مسافر ہوں۔''

بادشاہ نے کہا:

''ہم نے اپنی سلطنت میں مسافر خانے تعمیر کرائے ہیں تاکہ مسافر اس میں راحت و آرام سے رہیں۔''

شخص نے کہا:

''یہ دربار بھی تو مسافر خانہ ہے۔''

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے کہا:

''یہ شاہی دربار ہے۔ مسافر خانہ نہیں۔''

اس شخص نے سوال کیا:

''اس تخت پر آپ سے پہلے کون براجمان تھا؟''

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے کہا:

’’میرے باپ۔‘‘

اس شخص نے پوچھا:

’’آپ کے والد سے پہلے یہ تخت کس کے قبضے میں تھا؟‘‘

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے کہا:

’’اس تخت پر میرے دادا بیٹھتے تھے۔‘‘

اس شخص نے پوچھا:

’’اور اس سے پہلے یہ تخت کس کے پاس تھا؟‘‘

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے کہا:

’’اس سے پہلے اس شخص کے پاس سلطنت تھی جس سے میرے پرکھوں نے یہ سلطنت حاصل کی۔‘‘

وہ شخص بولا:

’’پھر مسافر خانہ کسے کہتے ہیں؟‘‘

یہ کہہ کر وہ شخص جس شان بے نیازی سے دربار میں داخل ہوا تھا اسی بے نیازی سے دربار سے چلا گیا۔

حضرت ابراہیم ادھمؒ نیک بادشاہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی سے دعا کرتے تھے۔ تہجد گزار تھے۔

ایک رات تہجد کی نماز کیلئے اُٹھے تو انہیں آواز آئی کہ:

’’چھت پر کوئی چل رہا ہے۔‘‘

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے رعب دار آواز سے پوچھا:

’’چھت پر کون ہے؟‘‘

آواز آئی:

’’میں ہوں۔‘‘

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے پوچھا:

’’میں کون؟اور چھت پر کیا کر رہے ہو؟‘‘

اس شخص نے کہا:

’’میرااونٹ کھو گیاہے اسے تلاش کر رہاہوں؟‘‘

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے غصہ سے پوچھا:

’’محل کی چھت پر اونٹ کہاں ملے گا؟‘‘

اس بندے نے جواب دیا:

’’اے بادشاہ! شاہی محل میں اللہ کہاں ملے گا؟‘‘

پیارے بچو!

حضرت ابراہیم ادھمؒ پر اس بات کا اتنااثر ہوا کہ انہوں نے اپنی باقی کی زندگی اللہ تعالیٰ کی تلاش میں گزار دی اور انہیں اللہ تعالیٰ مل گئے۔

خدمت خلق

ایک نوجوان مسافر نے ایک بوڑھے بزرگ کے ہاتھ میں کھرپا دیکھا۔اس نے سوچا کہ دیکھنا چاہئے کہ بزرگ کھرپے سے کیا کام کر رہے ہیں؟ بوڑھے بزرگ نے لرزتے ہاتھوں سے زمین کا کچھ حصہ کھودا، لڑکھڑاتے قدموں سے نرسری میں گئے اور آم کا چھوٹا سا پودا اٹھالائے۔ کپکپاتے ہاتھوں سے بزرگ نے پودا زمین میں بو دیا اور مٹی برابر کر کے پودے کو پانی دیا۔ یہ سب کام کرنے کے بعد بوڑھے بزرگ کے جھریوں بھرے چہرے پر رونق آگئی۔ خوشی سے ان کے بوڑھے وجود میں توانائی کی لہر دوڑ گئی۔ نوجوان جو کافی دیر سے بوڑھے صاحب کی سرگرمی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا، ان کے قریب آیا، سلام کیا اور بولا:

"بڑے صاحب! مزاج عالی پر گراں نہ گزرے تو ایک بات پوچھوں؟"

بزرگ نے بوڑھی آنکھوں سے نوجوان کو دیکھا اور کہا:

"جو کہنا ہے کہہ دو۔"

نوجوان نے ادب سے عرض کیا:

"بڑے صاحب! آپ نے بہت محنت سے آم کا پودا لگایا ہے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔

جس وقت یہ پودا تناور درخت بنے گا اور اس پر آم لگیں گے تو کیا آپ دنیا میں ہوں گے؟

ایسا کام جو آپ کو نفع نہ پہنچائے، وہ کیوں کر رہے ہیں؟"

بوڑھے بزرگ نے ہنستے ہوئے نوجوان سے کہا کہ:

"مجھے معلوم ہے کہ جب یہ پودا پھل دار درخت بنے گا تو میں دنیا میں نہیں ہونگا۔ پودا لگانے کے بعد میں نے تصور میں دیکھا کہ میری اولاد، اولاد کی اولاد اس درخت کے پھل کھائے گی۔ اس کے سائے میں بیٹھ کر دھوپ کی تمازت سے محفوظ رہے گی۔ میں اس لئے خوش ہوں کہ میرے اس کام سے میری نسلوں کو فائدہ پہنچے گا۔"

درخت میں جب پھل لگے گا تو پرندے آئیں گے۔ درخت پر بیٹھ کر چڑیا چہچہائیں گی۔ لوگ کوئل کی کُوک سنیں گے۔ درخت پر جب آم لگیں گے تو بچے دیکھ کر خوش ہونگے اور جب درخت کا پھل پک جائے گا تو میرے بچے پھل توڑ کر کھائیں گے۔ کچے آم توڑ کر بچیاں اچار ڈالیں گی۔ مائیں آم کے رس میں دودھ ملا کر اور برف سے ٹھنڈا کر کے بڑوں اور بچوں کو پلائیں گی۔

دکان دار آم فروخت کر کے اپنے بچوں کو کھانا کھلائیں گے۔ اسکول کی فیس دیں گے اور بچے پڑھ لکھ کر عالم فاضل بن جائیں گے۔"

پیارے بچو!

نوجوان مسافر کے ذہن میں یہ بات تھی کہ جس کام کا ہمیں فائدہ نہ ہو وہ کام کیوں کریں؟ جبکہ بزرگ کی بات سے اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ ایسے کام جن کا فائدہ ہمیں نہیں ملتا مگر اس طرح کے کاموں سے ہم خوش ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ آنے والی نسلوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

حضرت نانا تاج الدین اولیاءؒ اور شیر

قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں:

نانا تاج الدینؒ ایک دن واکی شریف کے جنگل میں پہاڑی پر چند لوگوں کے ساتھ چلے گئے۔ نانا جیؒ مسکرا کر کہنے لگے:

میاں جس کو شیر کا ڈر ہو وہ چلا جائے۔ میں تو یہاں ذرا سی دیر آرام کروں گا، خیال ہے کہ شیر ضرور آئے گا۔ جتنی دیر قیام کرے اس کی مرضی۔ تم لوگ خواہ مخواہ انتظار میں مبتلا نہ رہو۔ جاؤ کھاؤ، پیو اور مزے کرو۔

بعض لوگ اِدھر اُدھر چھپ گئے اور زیادہ چلے گئے۔

میں نے حیات خان جو نانا تاج الدینؒ کے مرید (شاگرد) تھے، سے کہا کہ ۔۔۔۔۔۔

کیا ارادہ ہے؟

پہلے تو حیات خان سوچتے رہے، پھر زیر لب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر سوال کیا، چلنا ہے؟ یا تماشا دیکھنا ہے؟

بھلا باباصاحبؒ کو چھوڑ کے میں کہاں جاؤں گا؟ حیات خان بولے۔

گرمی کا موسم تھا، درختوں کے سایہ اور ٹھنڈی ہوا خمار کے طوفان اٹھا رہی تھی۔

تھوڑی دور ہٹ کے میں ایک گھنی جھاڑی کے نیچے لیٹ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر حیات خان اس طرح بیٹھ گئے کہ نانا تاج الدینؒ کو دیکھتے رہیں۔

نانا دبیز گھاس پر لیٹ چکے تھے، آنکھیں بند تھیں، فضا میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔

چند منٹ گزرے ہی تھے کہ جنگل بھیانک محسوس ہونے لگا۔ آدھا گھنٹہ ۔۔۔۔۔۔ پھر ایک گھنٹہ ۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد کچھ وقفہ ایسے گزر گیا جیسے شدید انتظار ہو۔ یہ انتظار ایک درندہ کا تھا۔ جو کم از کم میرے ذہن میں قدم بقدم حرکت کر رہا تھا۔ یکایک

ناناؒ کی طرف نگاہیں متوجہ ہو گئیں۔ان کے پیروں کی طرف ایک لانبا چوڑا شیر ڈھلان سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ بڑی آہستہ سے، بڑے ادب کے ساتھ۔

شیر نیم وا آنکھوں سے نانا تاج الدینؒ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ذرا دیر میں وہ پیروں کے بالکل قریب آ گیا۔نانا گہری نیند میں بے خبر تھے۔شیر زبان سے تلوے چھو رہا تھا۔چند منٹ بعد اس کی آنکھیں مستانہ واری سے بند ہو گئیں۔سر زمین پر رکھ دیا۔

نانا تاج الدینؒ ابھی تک سو رہے تھے۔شیر نے اب زیادہ جرأت کر کے تلوے چاٹنا شروع کر دیئے۔اس حرکت سے نانا کی آنکھ کھل گئی۔اُٹھ کر بیٹھ گئے۔شیر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔کہنے لگے تو آ گیا۔اب تیری صحت بالکل ٹھیک ہے۔میں تجھے تندرست دیکھ کر بہت خوش ہوا۔اچھا اب جاؤ۔شیر نے بڑی ممنونیت سے دم ہلائی اور چلا گیا۔

پیارے بچو!

جس طرح ہم آپس میں باتیں کرتے ہیں۔اُسی طرح ہم جانوروں سے بھی باتیں کر سکتے ہیں۔تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کا دوست بن جاتا ہے تو وہ کائنات کی ہر مخلوق کا دوست بن جاتا ہے۔

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ بہت امیر کبیر بزرگ تھے۔ ساری دنیا میں ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ان کے پاس بکریوں کا ریوڑ تھا، بکریوں کے سینگوں پر سونا منڈھا رہتا تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اس زمانہ میں وراثت میں انہوں نے ایک کروڑ روپے کا سرمایا چھوڑا۔

ساری دنیا میں ان کے مرید موجود تھے۔ان کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے مریدین کو تربیت دیتے تھے اور پھر معقول رقم دے کر انہیں دنیا کے مختلف علاقوں میں بھیجتے تھے اور حکم تھا کہ اس سرمایہ سے کاروبار کریں اور کاروبار میں آدھا نفع تمہارا اور آدھا نفع میرا۔ میرے نفع سے سلسلہ کی تعلیمات پھیلائیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات لوگوں تک پہنچائیں اور لوگوں کو نیک راستے پر کھڑا کردیں تاکہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات دنیا میں پھیل جائیں۔

ایک روز بستر پر آرام فرمارہے تھے کہ کسی صاحب نے باہر کے دروازہ پر دستک دی۔ بڑے بیٹے باہر تشریف لے گئے۔ سلام کیا اور پوچھا:

کون صاحب ہیں؟

انہوں نے کہا۔ وعلیکم السلام۔ صاحبزادہ کو ایک خط دیا اور کہا:

یہ خط اپنا اباجی کو دے دو اور وہ جو کچھ بھی فرمائیں مجھے آکر بتاؤ۔

صاحبزادے یہ خط لے کر اپنے والد صاحب کے پاس گئے اور انہیں خط دے دیا۔

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے خط پڑھا اور بیٹے سے فرمایا:

باہر جو صاحب کھڑے ہیں ان کو میرا سلام عرض کرو اور کہو۔۔۔۔۔۔آدھے گھنٹے بعد تشریف لائیں۔

اس دوران حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے لوگوں کی امانتیں واپس کیں اور بچوں کو نصیحت فرمائی:

’’نماز قائم کرو اور شریعت پر سچے دل سے عمل کرو۔ خود کو کسی سے برتر نہ سمجھو۔‘‘

یاد رکھو!

تکبر اور غرور بہت بڑا گناہ ہے۔ تکبر نے عزازیل کو ذلیل و رسوا کر دیا اور اس کے گلے میں لعنت کا طوق ڈال دیا۔

اللہ حافظ و ناظر ہے اور وہ ہمارے ہر عمل کو دیکھتا ہے۔ تمہیں چاہئے کہ تم لوگوں کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آؤ۔ میرا اصل ورثہ اللہ تعالیٰ کا علم ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور شریعت پر عمل کرنا ہے۔‘‘

یہ نصیحت فرما کر حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ خاموش ہو گئے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔

تجہیز و تکفین کے بعد صاحبزادے کو خیال آیا کہ وہ صاحب کون تھے جنہوں نے خط دیا تھا۔۔۔۔۔انہوں نے اپنے والد صاحب کے بستر کو کھولا جو لپیٹ دیا گیا تھا۔ تکیے کے نیچے سے وہ پرچہ ملا جو آنے والے صاحب نے دیا تھا۔

اس میں لکھا تھا:

’’السلام علیکم!

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ! آپ کو اللہ تعالیٰ نے یاد فرمایا ہے۔ میرے لئے کیا حکم ہے۔۔۔۔۔؟‘‘

(عزرائیل ملک الموت)

خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کی بچوں کیلئے لکھی گئی کتب

معجزات ﷺ (بچوں کیلئے) بچوں کے محمد رسول اللہ ﷺ جلد اول

بچوں کے محمد رسول ﷺ جلد دوم بچوں کے محمد رسول اللہ ﷺ جلد سوم

ہمارے بچے (سیریل 1،2) حضرت آدم علیہ السلام

اسلامیات (پہلی جماعت کیلئے) اسلامیات (دوسری جماعت کیلئے)

اسلامیات (تیسری جماعت کیلئے) اسلامیات (چوتھی جماعت کیلئے)

اسلامیات (پانچویں جماعت کیلئے) اسلامیات (چھٹی جماعت کیلئے)

اسلامیات (ساتویں جماعت کیلئے) اسلامیات (آٹھویں جماعت کیلئے)

انصاری بک سینٹر

مرکزی مراقبہ ہال کراچی۔ پاکستان

فون: 34289548-021-92

ansaribooks@gmail.com